سعودی عرب ـــ تضادات کی سرزمین

جیمز ولے*

ترجمہ: سید محمد قاسم

سعودی عرب کی سلطنت جنوب مغربی ایشیا میں غیر مسلموں کی سیاحت کے راستے سے دور واقع ہے۔ اس لیے یہ ملک اسرار کے دھندلکوں میں کھویا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں اکثر معلومات قیاس اور اندازوں پر مبنی ہیں۔ تیل برآمد کرنے والے سب سے بڑے ملک اور اسلام کے دو مقدس ترین شہروں کے حوالے سے اس کی شناخت اس کی دیگر تمام خصوصیات پر حاوی ہے۔ شمالی امریکہ کے دوسرے امریکنوں کی طرح اس ملک کے بارے میں میں بھی کم علمی کے احساس جرم میں گرفتار تھا۔ نیشنل کونسل آف یو ایس-عرب ریلیشنز کے جوزف جے میلون فیلوشپ پروگرام کی جانب سے جوں ہی مجھے سعودی عرب اور اسلام کے مطالعاتی پروگرام کی اطلاع ملی، میں اس میں شرکت کے لیے بے تاب ہو گیا۔ یہ پروگرام ۱۹۹۷ء میں عرب دنیا کے بارے میں علم و آگہی دینے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ ایسے پروگراموں کے اجلاس و تقریبات غیر ملکیوں کو مقامی حکام اور اعلیٰ شخصیات سے میل ملاقات اور تعارف حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ عام طور پر کسی فرد واحد کے لیے از خود اتنے زیادہ روابط پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مجھے اس پروگرام میں شرکت کا موقع مل گیا اور میرے لیے وسیع رابطوں کے وہ تمام دروازے کھل گئے جو انفرادی طور پر سیر و سیاحت کرنے والے کے لیے عموماً بند ہوتے ہیں۔

اختلافات و تضادات

یہ سلطنت بہت سے اختلاف و اضداد کا مجموعہ ہے اور وسیع و عریض رقبہ پر محیط ہے۔ مگر اس کی آبادی ۱۸ ملین سے زائد نہیں۔ اس کی آبادی کا ایک تہائی حصہ غیر ملکیوں پر مشتمل ہے۔ یہ غیر ملکی یہاں

* James Wiley, "Saudi Arabia: Land of Contrasts - Some Keys to (Understanding) The Kingdom, *Focus*, Winter 1999. pp.28-32.

طویل عرصے سے رہتے ہیں اور اپنے کام کاج کرتے ہیں مگر انہیں سعودی عرب کی شہریت نہ حاصل ہے نہ آئندہ ہوگی۔

یہاں تیل اور گیس کے دنیا کے سب سے بڑے ذخائر ہیں لیکن پانی کی خاصی کمی ہے۔ یہ علاقہ قدیم سنگلاخ وادیوں اور ریگستان پر مشتمل ہے۔ بارش بھی خاصی ہوتی ہے لیکن اس کا پانی دوبارہ کسی جگہ نہیں ابلتا۔ اس لیے یہاں کسی حد تک موجود آبی ذخیروں کی اہمیت ملکی فلاح کے حوالے سے پیٹرول سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے سعودی حکومت کی اجناس کی پیداوار اور خود کفالت کی کوششوں سے قدرے بے رغبتی قابل فہم ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب زراعت کا کلیتاً انحصار آب پاشی پر ہے۔

سعودی عرب ایک خلوت پسند معاشرہ ہے۔ اس میں داخل ہونا بہت مشکل ہے۔ چلتے پھرتے تاجروں اور مسلمان زائرین کے لیے تو اس کے دروازے کھلتے ہیں مگر دوسرے سیاحوں اور مسافروں کے لیے بند رہتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب میں داخل ہونے والا سیاح پہلی بار میں مقامی لوگوں کے کھلے ذہن، دوستی، مہمان نوازی اور دریا دلی کا ضرور قائل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ جو قوموں کے اخلاق و اطوار کے نقشے کھینچتے ہیں عربوں کی ان خصوصیات کا ذکر تک نہیں کرتے۔

عرب لوگ اپنی صحرائی زندگی اور اسلام سے وابستگی پر فخر کرتے ہیں۔ سعودی عرب کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے مغربی لوگوں کی توجہ جنسی امتیاز پر مرتکز رہتی ہے۔ وہ بھاری پردوں میں چھپی ہوئی عورت کے مسائل اور مشکلات پر گفتگو کو ختم کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہاں عورت پر بہت سی پابندیاں ہیں جن میں عورتوں کے عوامی جگہوں پر گھومنے پھرنے کی ممانعت شامل ہے۔ لیکن گھر کے اندر عورت کو بہت زیادہ خود مختاری حاصل ہے۔ مگر یہ اہمیت اور اختیار باہر کے کسی فرد کو دکھائی نہیں دیتا۔ سعودی عرب کی عورت طلاق حاصل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اپنی جائیداد بنا سکتی ہے اور وراثت میں حصہ دار ہوتی ہے اور اب تو وہ یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم بھی حاصل کر سکتی ہے۔ خواتین پر پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے اکثر اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ سعودی عرب کے مردوں پر بھی کم و بیش اس قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔ ان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ گھر سے باہر اپنی رشتہ دار خواتین کے ساتھ رہیں۔

سعودی عرب ایک قدیم علاقہ اور نسبتاً ایک جدید ملک ہے۔ یہ مملکت ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی جب

شاہ عبدالعزیز نے اپنے خاندان کے ساتھ مل کر لشکر کشی کر کے اس وسیع علاقے میں قبیلوں کو زیر کر لیا تھا جو اب سعودی عرب کے نقشے میں شامل ہیں۔ نوے کے عشرے کی جدید سعودی عرب کی مملکت اس قدیم سعودی عرب سے کم ہی مماثلت رکھتی ہے جب یہاں چند سکول اور معمولی سڑکیں تھیں اور تیل کا نام ونشان تک نہ تھا۔ موجودہ تعمیر وترقی سب بعد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ترقی کا یہ دروازہ اس وقت کھلا جب ۱۹۳۳ء میں سعودی عرب کے بادشاہ نے سٹینڈرڈ آئل آف کیلیفورنیا کے ساتھ تیل کی تلاش اور اس کی فروخت کا معاہدہ کیا۔ یہ کوشش ۱۹۳۸ء میں اس وقت بارآور ثابت ہوئی جب عرب کے ساحلوں کے قریب دہران کے علاقے میں تیل کا ذخیرہ دریافت ہوا۔ اسے سعودی عرب کے لوگ خلیج عرب کہتے ہیں جب کہ مغربی دنیا اسے خلیج فارس کے نام سے جانتی تھی۔

تیل کی قیمتوں میں پہلا اضافہ ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ سعودی معاشرے میں یکا یک اور ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ جاپان ہی واحد ملک تھا جو اس تیز تر ترقی کی رفتار میں اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔ سعودی عرب ایک جانب بے مثال ترقی کی جانب قدم بڑھا رہا تھا تو دوسری جانب اپنی تہذیب وثقافت کی جنگ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ چند ہی عشروں میں سعودی عرب ایک نیم جاگیردارانہ معاشرے، مفلوک الحال، صحرائی اور بدویانہ زندگی، روایات کے اسیر ماحول، خانہ بدوشی سے نکل کر جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ، اعلیٰ شہری زندگی اور خلائی دور کی جانب گامزن ہو چکا تھا۔ ایسی برق رفتار تبدیلیاں اکثر بہت دشوار اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ لیکن تیل کے ذخیروں کی وسیع تر آمدنی نے اس خلا کو پورا کیا۔

سعودی عرب کو سمجھنے کا سوال ہمیشہ ایک چیلنج بنا رہا ہے۔ اس لیے میں اس موقع پر چند کلیدی نکات بیان کرنا چاہوں گا جو اس غیر معمولی معاشرے کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان بنیادی نکات کا تعلق اسلام، اقتصادی ترقی، ہیکل اساسی، ہجرت، انسانی ترقی، حکومت اور بین الاقوامی امور سے ہے ہر ایک کا تذکرہ یکے بعد دیگرے کیا جائے گا۔

موذن کی اذان

خاموشی اور سناٹے کو توڑتی ہوئی صبح پانچ بجے کی اذان فرد کے دل میں اس احساس کو بیدار کرتی

ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے سعودی عرب کو سمجھنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اثر تمام معاشرے میں سرائت کر جاتا ہے۔ سعودیوں کی مذہب کے بارے میں سنجیدگی اس بات کا مظہر ہے کہ بادشاہ کا منصب حقیقتاً ''خادم الحرمین شریفین'' ہونے سے مشروط ہے، علاقائی اور اقتصادی ذمہ داریاں اور حکومتی فرائض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر سال بیس لاکھ حاجیوں کے استقبال، قیام و طعام اور دیکھ بھال کے لیے خزانے سے خطیر رقم خرچ کی جاتی یا سرمایہ کاری کے طور پر صرف کی جاتی ہے۔ بحیرہ احمر کا شہر جدہ، مکہ اور مدینہ جانے والے حاجیوں اور زائرین کا تاریخی صدر دروازہ ہے۔ حاجیوں کے استقبال کے لیے بے شمار استقبالیہ مراکز تعمیر کیے گئے ہیں۔ عربوں کو عجمیوں سے بات چیت کرنے کے لیے خصوصی تربیت دی گئی ہے۔

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے وہ ایک عقیدے اور نظریے کا مذہب ہے جبکہ اسلام عملی مذہب ہے جس کے اثرات کو زندگیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اذان کی آواز دن میں پانچ وقت روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ عین اس وقت جب کاروبار زندگی عروج پر ہوتا ہے لوگ سب کام چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگتے ہیں۔ مغربی ممالک کے، وقت کے معاملے میں حساس، شہریوں کو معمول کی زندگی میں یہ ''مداخلت'' پریشان کن محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ یہ مداخلت معاشرے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ نماز کی جانب یہ پکار اجتماعیت اور اتحاد کا پیغام ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے امریکہ کے کسی لاطینی قصبے میں چرچ کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔

سعودی لوگ اپنی زیادہ تر توانائیاں غیر ملکیوں کو یہ بات سمجھانے پر صرف کرتے ہیں کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ وہ مغربی دنیا میں اسلام کا تاثر تباہ کرنے والے ذرائع ابلاغ، اسلام کی غلط اور خود ساختہ تصویر پیش کرنے والے ریڈیو اور ٹیلی ویژن، اخبارات اور فلموں سے سخت نالاں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے ساتھ دہشت و بربریت کو منسوب نہ کیا جائے یہ اسلام کی تصورات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ غلاموں کی تجارت اور سامراجیت عیسائی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔ سعودی عرب کی حکومت دہشت گردی کی تمام کارروائیوں کی مذمت کرتی ہے۔ اس امر کا پیغام اس نے ۱۹۹۷ء میں ایران میں منعقدہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں بھی دیا۔

پٹرولیم سے آگے

میلون سٹڈی پروگرام کے تحت سعودی عرب کے تین سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کے دورے کا پروگرام بھی وضع کیا گیا۔ اس میں نجد کا علاقہ دارالحکومت ریاض جو سعودی شاہی خاندان کا آبائی گھر ہے، مشرقی صوبہ جو خلیج کے ساحلی شہروں دہران اور دمام پر مشتمل ہے اور حجاز کا علاقہ جو بحیرہ احمر کے کنارے واقع ہے جس میں مقدس شہر مکہ اور مدینہ بھی شامل ہیں۔ یہ تینوں علاقے وہ ہیں جن پر سعودی عرب کی تیل کی آمدنی اور دیگر وسائل کا بڑا حصہ صرف ہوا۔ ۱۹۷۰ء سے اب تک ایک اعشاریہ ایک ٹریلین ڈالر مالیت کے اقتصادی ترقی کے منصوبے مکمل کیے گئے۔ اس دوران تعمیر و ترقی کے ایسے شہکار وجود میں آئے جن کا اس سے پہلے اس سرزمین پر تصور بھی مشکل تھا۔ خوبصورت ائیر پورٹس، دفاتر کی بلند و بالا عمارتیں، وزارتوں کی عالی شان تعمیرات، ہر قسم کے مال و اسباب سے بھرے ہوئے بازار، گرد و پیش جاری ایسے عظیم تعمیراتی سلسلے جو مصوری کی آنکھ ہی سے دیکھے جا سکتے تھے۔

سعودی عرب کے بزرگ شہریوں کو اس بات کا غم بھی کھائے جا رہا ہے کہ ان تعمیرات نے ان کے تاریخی تعمیری ورثے کو گم کر دیا ہے۔ اس بات کے پیش نظر بعض قدیم تاریخی عمارات کو محفوظ رکھنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔

سعودی عرب سرمایہ کاری کے لیے خطیر رقم داخلی وسائل سے پیدا کرتا ہے۔ اس لیے وہ ایسے تمام مسائل سے نمٹنے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے جو دیگر ترقی پذیر ممالک کو بنیادی اشیائے ضرورت کی تیاری اور برآمد میں درپیش ہیں۔ ایسے بے شمار صنعتی منصوبے جاری ہیں جو اشیائے ضرورت تیار کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ حکومت نے ۱۹۷۵ء میں ایک شاہی کمیشن تشکیل دیا تھا جس کے ذمے جبیل اور ینبوہ کے علاقوں میں دو نئے صنعتی شہر آباد کرنا تھا۔ اب ان شہروں کی آبادی ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے اور یہ پیٹرو کیمیکل مصنوعات کی نت نئی اقسام تیار کرنے میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی بیشتر پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے۔ آئندہ منصوبوں میں ایسی اشیاء تیار کرنا شامل ہے جن میں پیٹرو کیمیکل کی مصنوعات بطور خام مال استعمال کی جائیں۔ اس طرح کی صنعتوں کے قیام سے سعودی عرب کی صنعتی آمدنی میں بے شمار اضافہ ہوگا اور اس کی معدنی دولت کا بہترین استعمال بھی ہوگا۔ صنعتوں کے قیام میں اس امر کا بطور خاص خیال

رکھا جارہا ہے کہ شہری آبادی سے دور ہوں اور ان میں فضاء کو آلودہ کرنے والی گیسوں اور مواد کا اخراج کم سے کم ہو۔

اس طرح سعودی عرب کی موجودہ ترقیاتی منصوبہ بندی اس کی معیشت کو نئی جہتیں دکھائے گی۔ ترقیاتی منصوبوں کا آخری ہدف مجموعی قومی پیداوار (GDP) میں تیل کی آمدنی کے حصے کو گھٹا کر ایک چوتھائی تک لے جانا ہے۔ ان منصوبوں کی نگرانی حکومت کرتی ہے اور ۴۰ ارب ڈالر سالانہ کی سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ملکی و غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بھی ان پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے آمادہ کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے لیے بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ صنعتیں مستقبل میں قائم ہونے والی کثیر جہتی معیشت کو چلانے کے لیے انجن کا کام کریں گی۔ نیز سعودی عرب میں تعلیم یافتہ مزدوروں کی کھیپ کو بھی اپنے اندر سمولیں گی جس میں مزدور عورتیں اور مرد دونوں شامل ہیں۔ حکومت جوں جوں اپنے اہداف کی جانب بڑھ رہی ہے اسی حساب سے وہ زراعت کے شعبے میں دی جانے والی اعانتوں کو کم کر رہی ہے اور بجلی کے نرخوں میں اضافہ کر رہی ہے تاکہ پیداوار کی حقیقی لاگت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس اقدام کے ذریعے بجلی کے ضیاع کو روکا جا سکے گا جو ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے حکومت کی جانب سے غیر معمولی ارزاں نرخ پر فراہم کی جاتی ہے۔

ہجرت/نقل مکانی

انسانوں کی نقل مکانی ہمیشہ سے ایک دلچسپ روایت رہی ہے۔ موجودہ سعودی عرب میں اس کی بے شمار مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ اگر ان کی مجموعی آبادی کے ایک معمولی حصہ ہی نے دوسرے ممالک کو ہجرت کی۔ خانہ بدوشی کی روایت کے حوالے سے سعودی عرب کے شہریوں کا ہجرت کرنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن اب اونٹ کی جگہ کاروں نے لے لی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد سے سعودی باشندے اپنے جدید شہروں کی جانب بڑی تعداد میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ماضی قریب میں تین بڑے آباد علاقوں میں ملک کی نصف آبادی رہتی تھی جن میں غیر ملکی بھی شامل تھے۔ یہ انقلاب اس تیزی سے رونما ہوا اور اس کی وسعت گور سے گور تک عوامی فلاح کے لیے وقف تھی۔ یہ سب تیل کی آمدنی سے کیا جا رہا تھا۔ تمام وسائل عوام کی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے اور انہیں

اعلیٰ خدمات مہیا کرنے پر صرف کیے جا رہے تھے۔ ۱۹۷۰ء سے قبل زیادہ تر ترقیاتی سکیمیں اور فلاحی منصوبے بڑے شہروں تک محدود تھے۔ یہ بات بھی دیہات سے شہروں کی جانب انتقال آبادی کے رجحان کو تیز کرنے کا سبب بنی۔

نئے ترقیاتی منصوبے نسبتاً وسیع دائرے میں زیر تعمیر ہیں۔ اب محض تین بڑے علاقوں تک ترقیاتی کاموں کو محدود نہیں رکھا گیا۔ اب ملک کو ۱۰ بڑے علاقوں میں تقسیم کر کے ترقیاتی منصوبوں کو شروع کیا گیا ہے اور پورے ملک میں مکمل سماجی اور معاشی ڈھانچہ تعمیر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح شہروں کی جانب آبادی کی منتقلی کے رجحان کو کم کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ اب ریاض کے مقابلہ میں دیگر شہروں میں طلبہ اور اساتذہ کا تناسب زیادہ مناسب ہے۔

صحت عامہ اور طبی سہولتیں پورے ملک میں مفت دستیاب ہیں۔ ملک میں انتقال آبادی کا ایک ذریعہ غیر ملکی مزدوروں پر انحصار ہے۔ دنیا میں کم ہی ملک ہیں جہاں غیر ملکی مزدوروں کا وہ تناسب آبادی میں شامل ہے جیسا کہ سعودی عرب میں ہے۔ اس سلسلے میں اس کے پڑوسی خلیجی ممالک کے شہریوں کو بنیادی استثنےٰ حاصل ہے۔ ساٹھ لاکھ سے زائد غیر ملکی یہاں آباد ہیں۔ ان میں بعض تارکین وطن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک سے تعلق رکھنے والے انجینئر، بڑے تاجر اور پیشہ ور لوگ ہیں۔ تاہم ان کی تعداد غیر ملکیوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں معمولی ہے۔ ترقیاتی کاموں پر کام کرنے والے عارضی طور پر آئے ہوئے کارکنوں/مزدوروں کو تھرڈ کنٹری نیشنل TCN's کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ یہ کارکن عام طور پر دور دراز منصوبوں پر کام کرتے ہیں جہاں سعودی باشندے کام کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ ان میں بیشتر کا تعلق پسماندہ ممالک سے ہوتا ہے جو روزگار کی تلاش میں ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ٹھیکے داری کے طریقے پر بھرتی کیے جاتے ہیں۔ تعمیراتی کام کرنے والی کوئی کمپنی متعلقہ ملک میں جا کر مطلوبہ صلاحیت کے کارکنوں کو بھرتی کرتی ہے اور انہیں اپنی ذمہ داری پر سعودی عرب لے کر آتی ہے۔ ایسے کارکن زیادہ تر اسلامی ممالک سے آتے ہیں جن میں پاکستان، بنگلہ دیش اور مصر وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سوڈان اور صومالیہ جیسے افریقی ممالک سے بھی تعمیراتی کارکن بھرتی کیے جاتے ہیں۔ ان ممالک کے افراد سعودی عرب کی تہذیب و ثقافت سے خاصی قربت رکھتے ہیں اور مذہبی

لحاظ سے بھی یہ میزبان ملک کے عوام سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ کارکنوں کی بھرتی کے حوالے سے بھارت، سری لنکا اور فلپائن بھی نمایاں ممالک ہیں یہ اپنے ملک میں مزدوری کے مقابلے میں یہاں زیادہ کما لیتے ہیں۔ ان میں زیادہ اکثریت نوجوان کارکنوں کی ہوتی ہے جو اپنے کنبے کو اپنے ملک میں چھوڑ کر مجرد طور پر مزدوری کے لیے آتے ہیں۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے خاندان اور کنبے کے لیے بھیج دیتے ہیں جس سے ایک جانب ان کے خاندان کا معیار زندگی دوسروں کے مقابلے میں بلند ہوتا ہے اور دوسری جانب اس ملک کو قیمتی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

ایسے مہمان کارکنوں کی عارضی موجودگی ناگزیر ضرورت تو ہے البتہ مسائل سے خالی نہیں۔ ان کے استحصال کی خبریں اکثر ملتی ہیں خصوصاً گھروں میں کام کرنے والی عورتیں اس کا نشانہ بنتی ہیں۔ دولت مند نوجوانوں کے لیے سعودی معاشرے میں تفریح طبع کے بہت کم مواقع ہیں، کیونکہ یہاں عورت کی پاک دامنی کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کے میل جیل پر خاصی پابندیاں عائد ہیں۔ شام کے وقت بازار سیر گاہوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں مگر بغور جائزہ لینے پر حلت وحرمت کی پابندیوں پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ غیر ملکی کارکن اس معاشرے میں گھل مل نہیں سکتے۔ وہ اپنا کام ختم ہونے پر واپس اپنے وطن چلے جاتے ہیں۔

زیادہ تر سعودی باشندے سرکاری تعلیمی نظام سے مستفید ہو چکے ہوتے ہیں۔ حکومت نے اپنے باشندوں کو تعلیم وتربیت دینے کا خصوصی اہتمام کر رکھا ہے تاکہ وہ بتدریج غیر ملکی کارکنوں کی آسامیاں پر کر سکیں۔ مگر اس منصوبے پر ابھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سعودی باشندوں کو جن شعبوں میں تعلیم وتربیت دی گئی ہے وہ ان کاموں سے مطابقت نہیں رکھتی جو غیر ملکی انجام دے رہے ہیں تاہم سعودی باشندے آہستہ آہستہ غیر ملکیوں اور مہمان مزدوروں کی جگہ لے لیں گے۔

حیران کن انسانی ارتقا

سعودی عرب میں لوگوں نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی جدید منزلوں کو طے کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنی زندگی میں کامیابی سے استعمال کیا اس نے مغربی دنیا کے کھینچے ہوئے ان تمام خالی نقشوں اور تصورات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ قوم اپنی دولت کو نمود ونمائش پر ضائع کر دے گی

اور بی ایم ڈبلیو قسم کی بڑی بڑی گاڑیوں پر گھومنے والے اس کے امراء اپنی دولت کے استعمال سے بے خبر ہیں۔ کسی حد تک یہ منظر دیکھنے میں بھی آیا مگر دولت کا کثیر حصہ انسانی تعمیر و ترقی پر خرچ ہوا۔ اب کاوش ثمر آور ثابت ہو رہی ہے اور نئی صدی میں سعودی عرب ایک کامیاب مملکت کی حیثیت سے داخل ہو رہا ہے۔

تعلیم نے اس عمل کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کیا جو دو مراحل میں پورا ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں جب تیل کے وسائل سے مملکت کی آمدنی میں ڈرامائی اضافہ ہوا اس وقت تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے۔ سکولوں، یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ کی تعداد بہت کم تھی۔ البتہ حکومت میں تعلیم کی اہمیت کے بارے میں بصیرت کی کمی ہرگز نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تعلیمی ترقی ہی تیل کی دولت سے استفادہ کرنے کی اہلیت پیدا کر سکتی ہے۔ حکومت نے ۱۹۷۵ء میں ہزاروں طلبہ کو تعلیمی وظائف دے کر بیرون ملک بھیجا۔ سعودی عرب کی جانب سے پانچ لاکھ طلبہ صرف امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے گئے، جن میں ۴ فی صد سے زائد سعودی شہریت رکھتے تھے۔ یہ بات امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان خیر سگالی کے جذبات کا غیر سفارتی اور غیر رسمی ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ بہت سے طلبہ نے برطانیہ اور جرمنی وغیرہ میں داخلہ لیا۔ مجموعی طور پر بیرون ملک تعلیم حاصل کر کے یہ طلبہ واپس وطن آئے تو ان کی عمریں چالیس سے پچاس برس کے درمیان تھیں۔ یہ لوگ معاشرے میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف سرکاری اور نجی ملازمتوں اور کاروبار میں جن میں صحت عامہ، تعلیم اور تجارت کے شعبے شامل ہیں اعلیٰ عہدوں پر فرائض سرانجام دینا شروع کیے۔ یہی لوگ ملک کو انسانی وسائل کی ترقی کے دوسرے مرحلے تک لے آئے۔ تعلیم و تربیت کا ایک وسیع نظام وضع کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں سکولوں کی تعداد ۲۴۰۰ تھی جو ۱۹۹۷ء میں ۱۸,۴۰۰ سے تجاوز کر گئی۔

سات یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جن کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کی سہولت کے لیے جدید طرز کے رہائشی ہوسٹل اور مکانات بھی تعمیر کیے گئے، انہیں ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ کیا گیا۔ ان اداروں پر امریکی طرز تعلیم کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ سعودی عرب کے اعلیٰ تعلیمی ادارے شمالی امریکہ کی یونیورسٹیوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک کے لیے مضطرب ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں انٹرنیٹ کے حوالے سے باہمی رابطوں کا ایک سلسلہ تو شروع ہو چکا ہے۔

خواتین بھی اس تعلیمی سلسلے میں سرگرم نظر آتی ہیں۔ اگرچہ سعودی روایات طبی تعلیم کے اداروں کے سوا کسی دوسرے شعبے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے خلاف ہیں۔ اکثر سعوی مردوں کی رائے ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا تو معاشرے میں سختی کے یہ بند خود بخود کمزور پڑ جائیں گے۔ اس سلسلے میں پہلے ہی کافی نرمی پیدا ہو چکی ہے۔ ایک مسئلہ اب بھی حل طلب ہے کہ بیشتر کارگاہوں میں عورتوں اور مردوں کی کارکردگی کے حوالے سے کام کی تقسیم ہوتی ہے اس لیے عورتوں کے لیے ملازمت کے مواقع بہت کم رہ جاتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے تعلیمی نظام سے نکلنے والے تربیت یافتہ افراد لے لیتے ہیں۔

امن سے وابستہ مفادات

سعودی مملکت کو سمجھنے کے لیے ایک اہم کلید اس کی بین الاقوامی تعلقات کی پالیسی کو سمجھنا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے جغرافیائی اور سیاسی مسائل کے حل پر سوچنا تو ایک پیچیدہ معاملہ ہے البتہ ایک جدید مملکت کی حیثیت سے اس کے علاقائی کردار کو زیر بحث لانا مفید ہوگا۔ اقتصادی اور انسانی وسائل کی ترقی کے حوالے سے مذکورہ بالا گفتگو کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ کسی بھی علاقائی تنازع کی صورت میں یہ مملکت شدید نقصان اٹھا سکتی ہے۔ ایک اعشاریہ ایک ٹریلین ڈالر کی سرمایہ کاری اور اقتصادی ڈھانچے کی تعمیر نے سعودی عرب کو جنگی طالع آزماؤں کے ہاتھوں تباہی کے لیے پہلے سے زیادہ غیر محفوظ بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں علاقائی امن اور استحکام سعودی عرب کے لیے مغربی اندازوں سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ حکومت اپنے اس مقصد کے لیے خلیج تعاون کونسل کے ساتھ اشتراک عمل قائم کیے ہوئے ہے جس میں بحرین، کویت، اومان، قطر اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ اسے عراق، ایران اور اسرائیل کی جانب سے خطرات کا سامنا ہے۔ یہ کونسل کس طرح کام کرتی ہے اس کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ لاعلم ہیں۔ سعودی اپنے ان عرب بھائیوں کے لیے خصوصی ہمدردی رکھتے ہیں جو عراق میں ظالمانہ آمریت تلے کچلے ہوتے ہیں۔ یہ بات انہیں امریکی اقدامات سے زیادہ قریب کر دیتی ہے، جب یہ ممالک ضرورت سے زیادہ جنگجو رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سعودی عرب ایران کو مستحکم دیکھنا چاہتا ہے، وہ علاقائی امور میں یکسو ہونہ کہ موجودہ صورت حال کا سامنا ہو۔ اگرچہ یہ صورت حال بھی خلیج میں امریکی کارروائیوں کا نتیجہ ہے۔

امریکہ اور سعودی عرب میں موجودہ خوشگوار تعلقات اور خلیج میں امریکی پالیسیوں کے لیے سعودی عرب کی حمایت کا دارومدار مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن مذاکرات کی کامیابی اور ناکامی پر ہے۔ زیادہ تر سعودی اسرائیل کے وجود کے جواز کا سوال نہیں اٹھاتے۔ وہ اسرائیل کی سلامتی کے انتظام کو تسلیم تو کرتے ہیں جو زیادہ تر ہمسایہ ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات سے مشروط ہے نہ کہ ایک مضبوط فوجی طاقت کے بل پر وہ اپنی حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے۔ سعودیہ کی خواہش ہے کہ امریکہ اسرائیل پر فلسطینیوں کے ساتھ نتیجہ خیز مذاکرات کے لیے اپنا بھرپور دباؤ ڈالے۔

بلاشبہ کسی ملک کے متعلق جاننے کے لیے اس کے شہریوں سے میل جول ضروری ہے۔ میلون فیلوشپ پروگرام نے یہ موقع خوب بہم پہنچایا۔ ایسے مواقع کی یادداشتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور ایسے معاشرے کے جذبات اور خیالات سے آگاہ ہوا جو میرے تصورات سے مختلف ہے۔ میں سعودی شہریوں کی ذہانت، ظرافت طبع اور انکساری کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ان کی مہمان نوازی، دریا دلی، قہوے، چائے، کافی اور کھانے کی دعوتوں اور دلچسپ اور خوشگوار ملاقاتوں سے بہت متاثر ہوا۔ امریکہ اور امریکی ڈالر کے بارے میں ان کی معلومات بھی متاثر کن تھیں۔ ان کی امن کے قیام کی پرخلوص خواہش اور صلح جو فطرت قابل تعریف ہے۔ ہجرت کے موضوع پر تحقیق کرنے والے ایک جغرافیہ دان کے طور پر میں نے غیر ملکی مزدوروں سے مل کر ان کی داستانیں بھی سنیں اور اس ملک کی تعمیر میں ان کے کردار کے بھی اندازہ لگایا۔ قصہ مختصر، یہ سفر میرے لیے ایک دلچسپ دنیا کے لوگوں سے ملاقاتوں کا نادر موقع تھا، جس نے مجھے سلطنت سعودی عربیہ کی حقیقی کلیدوں سے آگاہ کیا۔